يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط (۶۷/۵)

اے رسولؐ! اس ضابطۂ حیات کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے تمام انسانوں تک پہنچا دو۔

وہ

عالمگیر افسانے

جنہیں حقیقت سمجھ لیا گیا

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور۔ فون ۸۷۶۲۱۹

وہ

عالمگیر افسانے

جنھیں حقیقت سمجھ لیا گیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہ عالمگیر افسانے جنہیں حقیقت سمجھ لیا گیا

انسانی ذہن بھی ایک عجیب طلسم ہوش ربا واقع ہوا ہے۔ آپ کسی بچّے سے کوئی صحیح واقعہ بیان کریں وہ چند منٹوں میں اکتا جائے گا۔ لیکن وہی بچہ، رات کو سونے سے پہلے، اپنی نانی اماں سے باصرار تقاضا کرے گا کہ اسے زمرد پری اور کالے دیو کی کہانی سنائے اور بتائے کہ شہزادہ ماہ رخ نے سلیمانی ٹوپی کہاں سے حاصل کی تھی۔ وہ اس کہانی کو، ہر شب، سونے سے پہلے، سنے گا اور کبھی نہیں اکتائے گا۔ لیکن یہی بچہ جب بڑا ہوجائے گا تو وہ جنوں اور پریوں کی کہانیوں کی طرف کبھی دھیان نہیں دے گا۔ وہ اب ان افسانوں میں کوئی لذت محسوس نہیں کرے گا۔

جس طرح ایک فرد کا ذہن، بچپن کے زمانہ میں، افسانوی کہانیوں میں جاذبیت محسوس کرتا ہے، اسی طرح نوعِ انسانی کا ذہن بھی، اپنے عہد طفولیت میں، حقائق کی جگہ افسانوں میں بڑی کشش پاتا تھا۔ لیکن ایک بچے کے ذہن اور نوعِ انسان کے عہدِ طفولیت کے ذہن میں، مماثلت یہیں تک ہے۔ اس سے آگے، ان دونوں میں ایسا بین فرق نظر آتا ہے جو حیرت انگیز بھی ہے اور غور طلب

بھی۔ جب بچے کو، جوان ہونے پر معلوم ہوجائے کہ جن کہانیوں کو وہ حقیقت سمجھا کرتا تھا، وہ حقیقت نہیں، افسانے تھے، تو اس کے بعد وہ انہیں کبھی حقائق نہیں سمجھے گا۔ لیکن نوعِ انسان کے ذہن کی کیفیت یہ ہے کہ جن افسانوں کو وہ اپنے عہدِ طفولیت میں حقیقت سمجھا کرتا تھا، ان کے متعلق اسے بعد میں بتا دیا گیا، سمجھا دیا گیا ------- اور بار بار بتا اور سمجھا دیا گیا --- کہ وہ افسانے تھے، حقائق نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود وہ انہیں حقائق ہی سمجھتا چلا جارہا ہے اور ان کہانیوں کو آج بھی اسی جاذبیت سے سنتا ہے، جس جاذبیت سے اپنے بچپن کے زمانے میں سنا کرتا تھا، حتیٰ کہ اگر کوئی اس سے کہے کہ یہ حقیقتیں نہیں، افسانے ہیں، تو وہ اس کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جاتا ہے۔ میں آج کی نشست میں، چند ایک ایسے افسانوں کا ذکر کروں گا جو ساری دنیا میں عام ہیں، ہزاروں برس سے عام چلے آرہے ہیں۔ اور یہ بتا دینے کے بعد بھی کہ یہ افسانے ہیں، حقیقتیں نہیں، انہیں برابر حقیقتیں سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ یہ حقائق نہیں، افسانے ہیں تو اس کے خلاف یوں کہرام مچا دیا جاتا ہے گویا اس سے کسی سنگین ترین جرم کا ارتکاب ہوگیا ہو۔ آپ غور سے سنئے کہ وہ افسانے کیا ہیں۔

سب سے پہلا اور قدیم ترین افسانہ

آج ایک انسانی بچے کی پیدائش ایسا معمولی واقعہ بن چکی ہے کہ اس کے متعلق نہ کسی کو کوئی حیرت ہوتی ہے نہ استعجاب۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مرد اور عورت کے جنسی اختلاط سے استقرارِ حمل ہوتا ہے اور اس طرح ایک انسانی بچہ پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ سوال کہ سب سے پہلا انسان ـــــ یا انسانوں کا جوڑا ـــــ کس طرح وجود میں آگیا' ایسا پیچیدہ اور مشکل ہے کہ ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں اس کا کوئی اطمینان بخش حل سوچ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے لئے' اس نے (مجبوراً) ایک افسانہ وضع کیا جس سے اس کا ذہنی خلجان دور ہوگیا۔ یہ افسانہ ہمیں' یہودیوں کی قدیم ترین مقدس کتاب' تورات میں ملتا ہے ـــــ واضح رہے کہ جو تورات اس وقت دنیا میں موجود ہے اور جس میں یہ افسانہ پایا جاتا ہے' وہ کتاب (یا کتابوں کا مجموعہ) وہ نہیں جو حضرات انبیاء کرامؑ کو' خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئی تھیں۔ یہ تورات' انسانی تحریفات کا مرقع ہے اسی لئے اس میں اس قسم کے افسانے پائے جاتے ہیں۔

تخلیقِ آدم: اس میں لکھا ہے کہ خدا نے زمین' اس کی نباتات اور حیوانات پیدا کرنے کے بعدؔ اور خداوند نے زمین کی مٹی

سے آدم کو بنایا اور اس کے نتھنے میں زندگی کا دم پھونکا۔ تو آدمی جیتی جان ہوا ○ (کتاب پیدائش، باب دوم، آیت نمبر ۷)

یعنی خدا نے ایک مٹی کا پتلا بنا کر، اس میں جان ڈال دی۔ اس طرح دنیا میں سب سے پہلا انسان وجود میں آگیا۔ لیکن تنہا ایک انسان سے تو کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس سے انسانی نسل وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ اس کے لئے عورت کی بھی ضرورت تھی۔ سو اس ضرورت کو یوں پورا کیا کہ:

> اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا ○ اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کر، اسے آدم کے پاس لایا ○ اور آدم نے کہا کہ اب وہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے اسی سبب سے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی ○ (کتاب پیدائش ۲۳۔۲/۲۱)

لیجئے، دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا حل مل گیا۔ جب ایک مرد اور ایک عورت وجود میں آگئے، تو نسلِ انسانی کے آگے چلنے میں

دشواری کیا باقی رہ گئی!

چونکہ یہ افسانہ دلچسپ بھی تھا اور ذہنِ انسانی کی ایک بہت بڑی الجھن کے دور کرنے کا موجب بھی' اس لئے یہ بڑا مقبول ہوا اور رفتہ رفتہ عالمگیر بن گیا۔ حتیٰ کہ اب یہ بتانا بھی مشکل ہوگیا ہے کہ دوسرے اہلِ مذاہب نے اسے تورات سے مستعار لیا تھا یا (محرّف) تورات کے افسانہ نگار نے اس کا پلاٹ کہیں اور سے اچک لیا تھا۔

قرآنی نظریہ: یہ افسانہ ساری دنیا میں عام اور مقبول ہو کر حقیقت کی شکل اختیار کرچکا تھا کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل' عرب کی سرزمین میں' نبیؑ آخرالزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوئے اور آپؐ نے' وحی کی زبان سے اعلان فرمایا کہ انسانی تخلیق کی ابتدا کا یہ تصور' ذہنِ انسانی کا تراشیدہ ہے۔ سب سے پہلے نہ کوئی ایک فرد مٹی سے بنایا گیا تھا' نہ اس کی پسلی سے عورت نکالی گئی تھی۔ نوعِ انسانی' سطحِ ارض پر زندگی کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ خدائے خالق کائنات کی اسکیم کے مطابق غیرذی حیات مادہ (IN -ORGANIC MATTER) اور پانی کے امتزاج (یعنی' قرآن کے الفاظ میں' طینِ لازب) سے زندگی کا اولین جرثومہ (LIFE - CELL) ظہور میں آیا جو جوشِ نمو سے دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس کا ایک حصہ نر کی خصوصیات کا حامل تھا

اور دوسرا مادہ کی۔ اس سے زندگی آگے بڑھنی شروع ہوئی اور جرثومات سے کیڑوں مکوڑوں کی شکل میں سامنے آئی۔ وہاں سے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی' آبی حیوانات اور پھر خشکی کے جانداروں کی صورت میں جلوہ پیرا ہوئی۔ اس سے آگے حیوانات کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا' پیکرِ انسانی میں نمودار ہوگیا۔ (میں نے' عزیزانِ من! اس مقام پر' قرآن کریم میں بیان کردہ' ارتقائے حیات کا ذکر محض اشارات میں کیا ہے۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اس سلسلہ میں قرآنی تفصیلات دیکھنے کے متمنی' وہ میری کتاب ——— "ابلیس و آدم" ——— میں' آدم اور انسان سے متعلق ابواب ملاحظہ فرمالیں۔ ان میں' قرآن میں بیان کردہ نظریۂ ارتقاء' پوری تفاصیل سے سامنے آجائے گا)۔

بہرحال' قرآن نے یہ نظریہ پیش کیا جس نے اربابِ فکر و نظر کو دعوت تحقیق و تجسس دی' اور جوں جوں سائنٹفک انکشافات آگے بڑھتے گئے' وہ قرآنی نظریۂ حیات کی زندہ شہادات بنتے گئے۔

قرآنِ کریم نے یہ کہا اور علمی تحقیقات نے اس کے دعویٰ کی اس طرح واشگاف طور پر تصدیق کر دی' لیکن ذہنِ انسانی کا بچپن ہے کہ وہ اس حقیقت میں کوئی جاذبیت نہیں پاتا اور بدستور اس افسانۂ کہن کو وجہ دل کشی بنائے ہوئے ہے۔ بلکہ' جیسا کہ ہر

افسانے کے ساتھ ہوتا ہے' مرُورِ زمانہ نے اس کے خاکہ میں طرح طرح کی رنگ آمیزیاں کر دی ہیں۔ اور حیرت اندر حیرت' کہ یہ داستان گوئی اسی قوم کے لٹریچر کی باعثِ زینت بن رہی ہے جو قرآن مجید کو خدا کا کلام مانتی ہے اور قیامت بالائے قیامت کہ وہ ان افسانہ طرازیوں کو منسوب کرتی ہے (اور غلط منسوب کرتی ہے) اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف جس نے دنیا کو علم و حقائق کی ایسی درخشندہ و تابناک شمع (قرآن) عطا کی۔ سنئے کہ اکثے ہاں یہ افسانہ کن الفاظ میں دہرایا جاتا ہے۔

تفسیری بیانات: ہمارے ہاں تفسیر ابنِ کثیر کو بڑا معتبر مانا جاتا ہے۔ اس میں تخلیقِ آدم کے سلسلہ میں پہلے یہ مذکور ہے کہ:

فرشتے بدھ کے دن پیدا ہوئے۔ جانور جمعرات کے دن اور آدم جمعہ کے دن (اردو ترجمہ' پارہ اول' صفحہ ۹۰)

آدم کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے۔

پھر آدم علیہ السّلام کی مٹی اٹھائی گئی جو چکنی اور اچھی تھی۔ جب اس کا خمیر اٹھا تب اس سے حضرت آدم علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور چالیس دن تک وہ یونہی پتلے کی شکل میں رہے۔ ابلیس آتا تھا اور اس پر لات مار کر دیکھتا تھا کہ وہ بجتی مٹی تھی جیسے کوئی کھوکھلی چیز ہو۔ پھر منہ کے سوراخ سے گھس کر پیچھے

کے سوراخ سے' اور اس کے خلاف آتا جاتا رہا ------- پھر جب اللہ نے ان میں روح پھونکی اور وہ سر کی طرف سے نیچے کی طرف آئی تو جہاں جہاں تک پہنچتی رہی خون' گوشت بنتا گیا۔ جب ناف تک روح پہنچی تو وہ اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور جھٹ سے اٹھنا چاہا لیکن نیچے کے دھڑ میں روح نہیں پہنچی تھی اس لئے اٹھ نہ سکے ------- جب روح سارے جسم میں پہنچ گئی اور چھینک آئی تو کہا الحمد للہ رب العلمین۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا یرحمک اللہ (ایضاً" صفحہ ۹۸)

آدم کی بیوی: یوں ان تفاسیر کی رو سے "(حضرت) آدم (علیہ السلام)" پیدا ہوئے۔ اس کے بعد' ان کی بیوی کی پیدائش کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "آپ تن تنہا تھے۔ (ایک دن) آپ پر نیند کا غلبہ ہوا تو آپ کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔ جاگ کر انہیں دیکھا تو پوچھا کہ تم کون ہو اور کیوں پیدا کی گئی ہو؟ انہوں نے کہا کہ میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کا سبب بننے کے لئے پیدا کی گئی ہوں۔" (ایضاً" صفحہ ۱۰۱)

عورت کے پسلی سے پیدا کئے جانے کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

> صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے ٹیڑھی ہے۔ پس اگر تو اسے بالکل سیدھی کرنے کو چاہے گا تو توڑ دے گا۔ اور اگر اس

میں کچھ کجی باقی چھوڑتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھانا چاہے گا تو تو بے شک فائدہ اٹھا سکتا ہے (پارہ چہارم' صفحہ ۷۳)

رنگینیٔ داستان: یہاں تک افسانہ کچھ پھیکا پھیکا سا تھا۔ اب دیکھئے کہ اس میں رنگینیاں کس طرح پیدا کی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے

> حضرت آدم (علیہ السلام) نے جب اس (عورت) کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وحی کے ذریعے اللہ کا حکم پہنچا کہ آپ اس وقت تک اسے چھو نہیں سکتے جب تک اس کا مہر نہ ادا کر دیں۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے پوچھا کہ اے پروردگار! اس کا مہر کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس کا مہر یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آلِ محمدؐ پر دس بار درود بھیجا جائے .... حضرت آدمؑ نے دس مرتبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آلِ محمدؐ پر درود بھیجا اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ دونوں کے مابین نکاح قائم ہوا اور اس جمعہ کے آخری حصہ میں فرشتوں کو حکم ملا کہ یاقوت اور سچے موتیوں کے زیور اور لباس زینت سے حضرت حوا کو آراستہ کرکے دونوں کو جنت میں داخل کر دیا جائے۔

یہ تفصیل بیان کردہ ہے کراچی کے مولانا احتشام الحق

صاحب کی جسے انہوں نے اپنے درسِ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ------ اور ایک مولانا احتشام الحق صاحب پر ہی کیا موقوف ہے' یہ آپ کو ہر محراب و منبر سے سنائی دے گی۔ اور پھر عرض کردوں کہ اس کی نسبت کی جائے گی حضور ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ------ یا للعجب!

واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں بیان کردہ قصہ آدم' کسی ایک فرد یا ایک جوڑے کی داستان نہیں۔ آدم سے مراد آدمی ہے اور وہ خود انسان کی سرگزشت کا تمثیلی بیان ہے۔ قرآنِ کریم میں اس قصہ سے ہٹ کر صرف ایک مقام پر آدم کا لفظ آیا ہے جہاں کہا ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ

○ ۳ / ۳۳ ہم نے آدم' نوح' آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو اقوامِ عالم میں سے برگزیدہ کیا۔ اس آیت میں اگر آدم سے مراد کوئی خاص فرد ہے اور وہ نبی تھے تو وہ یقیناً" وہ آدم نہیں ہوسکتے جن کا تمثیلی ذکر قرآن میں آیا ہے۔ اس لئے کہ ایک نبی کی شان سے بعید ہے کہ خدا اسے خاص طور پر تاکیداً" ایک کام سے منع کرے اور وہ اس کے علی الرغم اس کی خلاف ورزی کرے اور یہ جرم ایسا ہو جس کی پاداش میں اسے جنت سے نکال دیا جائے۔ کوئی نبی ایسا

نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا' میں نے جس افسانے کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق کسی نبی سے نہیں ہوسکتا۔ اب آگے بڑھئے۔

دوسرا افسانہ — عورت کی حیثیت

اسی افسانہ کا دوسرا حصّہ یہ ہے کہ (تورات کے بیان کے مطابق) خداوند خدا نے آدم اور حوا کو باغِ عدن میں رہنے کے لئے کہا اور وہاں ہر طرح کا سامانِ رزق مہیا کر دیا لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کر دیا۔ لیکن عورت' سانپ (شیطان) کے بہکاوے میں آگئی اور اس درخت کے پھل کو کھالیا اور اس کے بعد اپنے خاوند کو بہکا کر پھل کھلا دیا۔ اس پر خدا نے اس عورت سے کہا کہ تو نے جو یہ گناہ کا کام کیا ہے تو:

میں تیرے حمل میں تیرے درد کو بہت بڑھاؤں گا اور تو درد سے بچے جنے گی اور اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ (پیدائش ۳/۱۶)

تمام گناہوں کا سرچشمہ عورت: یعنی عورت شیطان کے فریب میں آگئی اور اس کے بعد اس نے مرد کو بھی بہکا دیا۔ اس سے یہ نتیجہ مرتب کیا گیا کہ دنیا میں تمام گناہوں کا سرچشمہ عورت ہے۔

اس سے آگے بڑھے تو اس افسانے میں اس ٹکڑے کا بھی

اضافہ کر دیا کہ اب ہر انسانی بچّہ اپنے اوّلیں ماں باپ کے گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے دنیا میں آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر' انسان اپنی فطرت کی رو سے' بدکن اور گنہگار واقع ہوا ہے۔

اس افسانے نے انسانی زندگی کو کس قدر گھناؤنا بنا دیا اور عورت کو کس قدر نفرت انگیز پستی کے گڑھے میں دھکیل دیا' اس کی شہادت تاریخِ انسانی کے اوراق سے مل سکتی ہے۔ اس سے نوعِ انسان کی نصف آبادی مقامِ آدمیت سے نیچے گر گئی اور دنیا ایک ایسا جیل خانہ بن کر رہ گئی جس میں انسان کو سزا بھگتنے کے لئے مجبوراً" بھیج دیا جاتا ہے۔

قرآن کا بیان: یہ افسانہ بھی عالمگیر حیثیت اختیار کرچکا تھا کہ قرآن آیا اور اس نے آکر کہا کہ یہ داستان بھی سراسر کذب و افترا ہے۔ اس نے کہا کہ نہ ہی عورت نے مرد کو بہکایا اور نہ ہی وہ گناہوں کا سرچشمہ ہے۔ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں اور جس قدر صلاحیتیں انسان کو دی گئی ہیں' وہ ان دونوں میں موجود ہیں۔ دونوں' انسان ہونے کی جہت سے' یکساں واجب التکریم ہیں اور مصافِ زندگی میں' ایک دوسرے کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل۔

ہماری افسانہ طرازی: قرآنِ کریم' اس افسانے کی

جگہ حقیقت کو سامنے لایا لیکن کچھ عرصہ کے بعد، ذہن انسانی کے بچپن نے پھر اسی افسانہ کو اپنالیا۔ چنانچہ خود مسلمانوں نے عورت کے متعلق وہی تصور قائم کرلیا جسے قرآن نے مٹایا تھا۔ عورت ناقص العقل ہے، ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اس لئے ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی۔ مرد، عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں۔ اس کی تائید میں اس قسم کی روایات وضع کی گئیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کرسکتا کہ وہ ماسوائے اللہ کے دوسرے کو سجدہ کرے، تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ (تفسیر ابن کثیر، پارہ پنجم، صہ ۲۲)۔

یا یہ کہ حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظمؓ کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاقی ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے، اشعثؓ! تین باتیں یاد رکھو جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یاد کررکھی ہیں۔ ایک یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی بیوی کو کیوں مارا ہے۔ دوسرے یہ کہ وتر پڑھے بغیر نہ سونا۔ تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی (تفسیر ابن کثیر، پارہ پنجم، صفحہ ۲۲)۔ کہیں یہ کہا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے معراج کی شب دیکھا کہ دوزخ میں عورتوں کی اکثریت تھی۔ اسی تفسیر میں لکھا ہے کہ جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو

قتل کر دیا تو شیطان نے آکر اس کی اطلاع حضرت حوا کو دی جسے وہ سن کر چیخنے چلانے لگیں۔ اتنے میں حضرت آدم آئے اور بیوی سے پوچھا کیا بات ہوئی۔ لیکن حضرت حوا رونے چلانے میں مصروف رہیں اور کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت آدم کے کئی بار پوچھنے پر بھی انہوں نے کوئی جواب نہ دیا تو آپ نے بیوی سے کہا کہ اچھا! اگر تو روتی ہے تو جا۔ تیری بیٹیاں ہمیشہ روتی رہیں گی۔ یہ وجہ ہے کہ عورت کی قسمت میں ہمیشہ رونا ہی لکھا ہے۔ (ایضاً" چھٹا پارہ، صفحہ ۸۵)

وضعی روایات نے اس قسم کے افسانے تراشے تو شاعروں نے آگے بڑھ کر مضمون اٹھایا اور عورت کے متعلق اس قسم کے تصورات کو عام کیا۔

اگر نیک بودے سر احوالِ زن
زناں رامزن نام بودے نہ زن
چہ خوش گفت جمشید ہارائے زن
کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن
مشو ایمن از زن کہ زن پارساست
کہ خرستہ بہ گرچہ دُزدو آشنا است

اور یہ چیز شاعروں تک ہی محدود نہ رہی۔ ہمارے ہاں کے اولیائے کرام اور بزرگانِ عظام نے بھی اس باب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مثلاً" حضرت داتا گنج بخش" فرماتے ہیں:

بہشت میں پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا' اس کا اصل سبب یہی
عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا' یعنی ہابیل
اور قابیل کی لڑائی' اس کا سبب بھی عورت تھی اور جب
خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں کو ہاروت و ماروت کو سزا
دے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا اور آج
دینی اور دنیاوی تمام فتنوں کے جملہ اسباب کا موجب بھی
عورت ہی ہے۔ (الاعتصام' ۲۱/۱۷ ستمبر ۱۹۵۸ء)

یہ ہیں وہ افسانے جنہیں آپ ہر وعظ کی مجلس اور ہر ارشاد کی دعوت میں سنتے چلے آرہے ہیں اور سنتے چلے جائیں گے۔ اور تماشا یہ کہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا جائے گا کہ بہشت' ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر عورت تمام فتنوں کی جڑ ہے تو پھر بہشت' ماں کے قدموں کے نیچے کیسے ہوسکتی ہے؟ کیا ماں عورت نہیں ہوتی' مرد ہوتی ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب تو عقل کی رو سے دیا جاسکتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اگر افسانے کا تجزیہ عقل کی رو سے کیا جانے لگے تو اس کی ساری لذت ختم ہوجاتی ہے۔ افسانے کی تو لذت ہی اس میں ہے کہ اس میں عقل کو دخل نہ دینے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے جو یہ افسانہ بھی وضع کیا گیا ہے کہ دین میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

پیدائشی تفریق: جہاں تک انسانی بچے کے گنہگار پیدا ہونے

کا تعلق ہے' ہم نے اس افسانے کو یوں تو نہیں اپنایا' لیکن جھونپڑی میں پیدا ہونے والے اور محل میں پیدا ہونے والے بچے کو ایک جیسا انسان ہم بھی نہیں سمجھتے۔ جھونپڑی میں پیدا ہونے والا بچہ تمام عمر ذلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ کیا یہ اس کے پیدائشی جرم کی سزا نہیں؟ اور محل میں پیدا ہونے والا بچہ جب اپنی پیدائش کے ساتھ ہی کئی فیکٹریوں' مربعوں' کوٹھیوں اور لاکھوں روپے کا مالک بن جاتا ہے' تو کیا یہ بھی محض اس کی پیدائش کا انعام نہیں؟ کیا یہ افسانے گناہِ اول (ORIGINAL SIN) کے افسانے سے کم حیرت انگیز اور وجۂ تذلیلِ انسانیت نہیں ہیں!

یا جب لڑکی کو لڑکے سے' اور عورت کو مرد سے' کم تر درجہ دیا جاتا ہے' تو یہ بھی لڑکی کے پیدائشی جرم کی سزا نہیں؟ کیا یہ اسی "گناہِ اول" کے افسانے کی صدائے بازگشت نہیں؟

دنیا قابلِ نفرت: باقی رہا دنیا کا جیل خانہ ہونا' تو خود ہمارے ہاں بھی اس قسم کی (وضعی) روایات عام ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا جیل خانہ ہے اور مومن کی حیثیت اس میں قیدی کی سی ہے! اور مقربینِ بارگہِ خداوندی کے نزدیک' دنیا سے زیادہ قابلِ نفرت چیز کوئی نہیں۔ یعنی جس دنیا کی تخلیق کو خالقِ کائنات فخر سے بیان کرتا ہے' اسے یہ حضرات قابلِ نفرت شے قرار دیتے ہیں۔ خالق کے حضور جھکنا اور اس کی تخلیق سے نفرت کرنا'

یہ بھی مقرب بننے کا عجیب طریقہ ہے!

تیسرا افسانہ ۔ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے

اسی سلسلہ میں ایک افسانہ یہ بھی ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ اس افسانہ نے ایسی عالمگیر حیثیت اختیار کر رکھی ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں اسے حکمِ خداوندی قرار نہ دیا جاتا ہو اور کوئی معاشرہ ایسا نہیں جس میں اس حکم کی اطاعت کو معیارِ سعادت و شرافت نہ سمجھا جاتا ہو، حتیٰ کہ ہندوؤں کے ہاں رام کو محض اس لئے ایشور کا اوتار بنا دیا گیا کہ اس نے باپ کے حکم کی بلاچوں و چرا اطاعت کی حالانکہ باپ اور بیٹا دونوں سمجھتے تھے کہ وہ حکم نامعقول ہے۔ جوان بیوی نے بوڑھے خاوند سے کہا کہ تم مجھے بچن دو کہ میں جو بات کہوں گی وہ مانو گے۔ اسنے بچن دیدیا تو اس نے کہا کہ تمہارے بعد تخت کا وارث میرا بیٹا ہوگا' رام نہیں ہوگا۔ باپ بھی سمجھتا تھا کہ یہ مطالبہ غیر معقول ہے اور بیٹا بھی۔ لیکن بیٹے نے محض باپ کے حکم کی اطاعت کے خیال سے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس کا یہ عمل ایسا بلند تصور کیا گیا کہ اسے مافوق البشر قرار دے کر ایشور کا اوتار۔۔ بلکہ خود ایشور ——— بنا لیا گیا۔

قرآن نے آکر اس افسانہ کو بھی باطل قرار دیا اور کہا کہ اس

میں شبہ نہیں کہ جب تک بچے اپنی زندگی آپ بسر کرنے کے قابل نہیں ہوتے، انہیں والدین کی راہ نمائی کے مطابق چلنا چاہئے لیکن جب وہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہوجائیں، انہیں اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے چاہئیں۔ وہ دوسروں کے تجربہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن دوسروں کے فیصلے ماننے پر مجبور نہیں کئے جاسکتے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ دنیا نے "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" کے عقیدہ کو محض نظری یا انفرادی حد تک رکھا۔ اگر عملاً" ہر آنے والی نسل، جانے والی نسل کے فیصلوں کی اطاعت کرتی رہتی تو دنیا آج وہیں ہوتی جہاں پہلا انسان تھا۔ اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتی۔ قرآن نے آکر کہا کہ زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی، آگے بڑھتی چلی جارہی ہے، اس لئے ہر دور کے تقاضے، سابقہ دور سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا، ہر نسل کو اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے آپ فیصلے کرنے چاہئیں۔ اطاعت صرف احکام و اقدارِ خداوندی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی رُو سے، ماڈل کسی رام کی زندگی نہیں، حضرت ابراہیمؑ کی ہے جس نے کھلے بندوں اپنے باپ سے کہہ دیا کہ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً کیا تم ان مٹی کی مورتیوں کو اپنا خدا بنائے ہوئے ہو۔ اِنِّیْٓ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ (۶/۷۵) میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اور تمہاری قوم کھلی ہوئی گمراہی پر ہے۔

قرآن نے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے،
ان کی اطاعت کا نہیں۔

"ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" کے عقیدہ کو آگے بڑھایئے تو اسلاف کی تقلید کا عقیدہ سامنے آجاتا ہے۔ اور اسلاف پرستی کا عقیدہ بھی دنیا میں مسئلہ کی حیثیت اختیار کرچکا تھا کہ قرآن کریم نے آکر اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا اور کہا کہ یہ کفّار کی رَوِش ہے کہ **وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا** ، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں۔ ہم تو اسی طریقہ پر چلتے جائیں گے جس طریقہ پر ہمارے اسلاف چلتے آرہے ہیں۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ **اَوَلَوْ كَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِیْرِ** ○ (۳۱ / ۲۱) خواہ انہیں اس طرح شیطان جہنم کے عذاب کی طرف ہی کیوں نہ بلا رہا ہو' یہ اسی راستے پر آنکھ بند کیے چلے جائیں گے!

قرآنِ کریم نے یہ کہا اور ہم نے اس کے بعد پھر انہی بتانِ کہن کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور حریم کعبہ میں آراستہ کر دیا۔ کہیں ماں باپ کی اطاعت فرض ہے کا عقیدہ' کہیں اسلاف کے اتباع کا عقیدہ اور یہ اتباع اس حد تک کہ بچوں کو یہ پڑھایا جانے لگا کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

یعنی بڑوں کی غلطی پکڑنا' بجائے خویش بہت بڑی غلطی اور گناہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ جو غلطی دو چار سو سال پہلے کہیں ہو چکی تھی وہ اسی طرح مسلسل چلی آرہی ہے۔ بلکہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے وہ اور مقدس بنتی جاتی ہے اور کوئی شخص اس غلطی کو غلطی کہہ دے تو اس کے خلاف شور برپا کر دیا جاتا ہے۔ یہی ہے ہماری قوم کی وہ ذہنیت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؔ نے کہا تھا کہ:

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب — پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

اور قوم کو یہ وارننگ دی تھی کہ یاد رکھو۔

دمادم نقشہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

چوتھا افسانہ ––– حقیقتِ کائنات

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مذہب کی دنیا میں چونکہ توہم پرستی عام ہوتی ہے' اس لئے اس قسم کی افسانہ تراشی مذہبیات تک ہی محدود ہوتی ہے۔ فکر کی دنیا میں افسانے نہیں ہوتے۔ وہاں حقائق سے بحث ہوتی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ فکر کی دنیا میں بھی

ایسے ایسے افسانے تراشے جاتے ہیں جو مذہبی دیو مالا سے کسی طرح کم ہوش رُبا اور تحیّر خیز نہیں ہوتے۔ دنیائے فکر میں افلاطون (PLATO) کا جو مقام ہے اس کا کسے علم نہیں۔ وہ اڑھائی ہزار سال سے' جہانِ حکمت و دانش کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس امامِ عقل و فکر نے کیا افسانہ تراشا؟

طلسمِ افلاطون: اس نے کہا کہ یہ محسوس کائنات جو ہمارے سامنے ہے' درحقیقت موجود نہیں۔ اس کائنات سے ماوراء ایک عالمِ امثال (World Of Ideas) ہے۔ وجود اس کا ہے۔ اشیائے کائنات' عالمِ امثال کا سایہ ہیں۔ لہذا — "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"۔ —افلاطون کے دلائل اس قدر نگاہ فریب اور اس کی منطق ایسی سحر انگیز تھی کہ اس نے اقوامِ عالم کے دماغوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا' اور اس کے اس نظریۂ کائنات کی بنیادوں پر' عجیب و غریب قسم کے مکاتبِ فکر و مدارسِ حکمت کی فلک سیر عمارات استوار کی گئیں جنہوں نے انسانیت کے قوائے عملیہ کو شل کر کے رکھ دیا۔ اس لئے کہ جب کائنات کے متعلق یہ نظریہ قائم کر لیا جائے کہ اس کا وجود' محض فریبِ نگاہ' مایا یا سراب ہے' تو اس میں نہ کوئی جاذبیت باقی رہے گی اور نہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے' اپنے مقام کو بلند کرنے کی سوچے گا۔ اقوامِ عالم' حکمتِ افلاطونی کے اس خواب آور طلسم میں مدہوش تھیں کہ

قرآن کا نظریہ : قرآن آیا اور اس نے صُورِ اسرافیل کی صاعقہ ریزیوں کے ساتھ یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ **خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ** (۵ / ۳۹) خدا نے سلسلۂ کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ فی الحقیقت موجود ہے۔ ایک (REALITY) ہے اور بالمقصد پیدا کی گئی ہے۔ اس حقیقت کو حتمی طور پر واضح کرنے کے لئے دوسری جگہ کہا کہ **وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا** ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ فریبِ نگاہ نہیں۔ یہ مایا نہیں' سراب نہیں' حلقۂ دامِ خیال نہیں' بے مقصد نہیں' بے غرض و غایت نہیں۔ **ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا** جو ایسا خیال کرتے ہیں وہ کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ حقائق سے انکار کرتے ہیں اور محض ظن و قیاس سے کام لیتے ہیں۔

یہ تو اس افلاطونی باطل نظریہ کی علمی حیثیت ہے۔ جہاں تک عملی دنیا کا تعلق ہے' کائنات کو مایا اور سراب قرار دینے والوں کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں۔ **فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنَ النَّارِ** (۲۷ / ۳۸) اس طرح قرآن نے طلسمِ افلاطونی سے مدہوش انسان کو جھنجوڑا اور کہا کہ **وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ** (۱۳ / ۴۵) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' خدا نے اسے تمہارے لئے تابعِ تسخیر کر دیا

ہے۔ اٹھو اور فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے اپنے لئے ایک نئی دنیا کی تشکیل کرو۔

قرآن کا یہ اعلانِ عظیم، ایک نعرہ نہیں تھا، بجلی کا کڑکا تھا جس نے انسانی ذہن کی کھڑکیاں کھول دیں۔ اور جس قوم نے سب سے پہلے اس کے مطابق عمل کیا، وہ چند ہی سال کے عرصہ میں نہ صرف قیصر و کسریٰ کی دولت و ثروت کی مالک بن گئی بلکہ اس نے جہانِ تمدن میں ایک ایسی تہذیب، ایک ایسے تصورِ حیات، ایک ایسے نظریۂ زندگی کی بنیاد رکھ دی جو دنیائے قدیم اور جہانِ نو کے درمیان حدِ فاصل بن کر کھڑی ہے۔

قرآن نے اس طرح طلسمِ افلاطونی کی دھجیاں فضائے عالم میں بکھیر کر رکھ دیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد، یہ طلسماتی افسانہ، تصوف کا مقدس لبادہ اوڑھ کر، مسلمانوں کے قلب و نظر پر چھا گیا۔

تصوف کا افسانہ: تصوف کا سارا لٹریچر، اسی افسانہ افلاطون کی سحر آفرین و فریب انگیز تشریحات کا مرقع ہے جسے تمثیلات کے حسین و رنگین اطلسی غلافوں میں لپیٹ کر باعثِ دلفریبیٔ عالم بنایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہی قوم جو دنیا کے ہر باطل نظام پر برقِ خاطف بن کر گری تھی، اپنی روٹی، بلکہ ہستی تک کے لئے باطل نظاموں کی دستِ نگر اور خدافراموش

ایوانوں کی آستاں افتادہ ہو رہی ہے۔ یہی تھا وہ افلاطون، جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ۔

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم
بہ تخیل ہائے ما فرماں رواست
جامِ اُو خواب آور و گیتی رباست
گوسفندے در لباسِ آدم است
حکمِ اُو بر جانِ صوفی محکم است

اور یہی ہے وہ تصوّف جسے حضرت علاّمہ نے، اپنی شہرۂ آفاق نظم "ابلیس کی مجلسِ شُوریٰ" میں، ابلیس کی گہری سازش قرار دیا ہے اور اس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ ۔

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

پانچواں افسانہ ـــــــــ انسانی فطرت

دنیائے فکر ہی کا ایک اور افسانہ ہے جس کا عنوان ہے ـــ انسانی فطرت __ (یعنی HUMAN NATURE)- یہ افسانہ بھی اس قدر قدیم اور عالمگیر ہے کہ دنیا کا کوئی مکتبِ فکر یا گوشۂ مذہب ایسا نہیں جو انسانی فطرت کو نہ مانتا ہو۔ فطرت کسی شے کی اس خصوصیّت (یا خصوصیات کے مجموعہ) کو کہتے ہیں جو ناقابلِ تغیر ہوں۔ بالفاظِ دیگر' یوں سمجھئے کہ کوئی شے اپنی فطرت بدل نہیں سکتی۔ وہ مجبور ہوتی ہے' صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں ہوتی۔ آگ کی فطرت ہے کہ وہ حرارت پہنچائے۔ پانی کی فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے۔ شیر کی فطرت درندگی ہے۔ یہ فطرت' ہر شے کے اندر موجود ہوتی ہے' تعلیم و تربیت کے ذریعے' خارج سے اس کے اندر داخل نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان چیزوں کی طرف کسی رسول کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہوتی جو (مثلاً) بکری کو بتائے کہ تم پر گوشت حرام کیا گیا ہے اور نباتات حلال۔ نہ ہی ان سے کسی قسم کا مواخذہ ہو سکتا ہے۔ سانپ' سیکڑوں انسانوں کو ڈس کر ہلاک کر دیتا ہے لیکن اس پر نہ انسانوں کی عدالت میں مقدّمہ چل سکتا ہے نہ خدا کی عدالت اسے مجرم قرار دیتی ہے۔ یہ اشیائے کائنات کی حالت ہے۔ لیکن ذہنِ انسانی کی اعجوبہ پسندی نے یہ افسانہ تراشا کہ انسان کی

بھی ایک فطرت ہے اور اس افسانے نے ایسی ہمہ گیریت اختیار کرلی کہ اسے ہرزمانہ' ہر ملک اور ہر قوم میں ایک مسلّمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ---- اگرچہ یہ کوئی متعیّن نہ کرسکا کہ انسانی فطرت ہے کیا؟

قرآن آیا اور اس نے کہا کہ ''انسانی فطرت'' کا تصوّر بھی ذہنِ انسانی کا تراشیدہ ہے جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

قرآنی نظریہ: انسان کی ایک طبعی زندگی ہے (PHYSICAL LIFE) اور ہر حیوان کی طرح اس کی اس زندگی کے کچھ تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کو دو بنیادی شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی تحفظِ خویش (SELF - PRESERVATION) اور بقائے نسل (SELF- RE- PRODUCTION)۔ یہ تقاضے حیوانی جبلّت (ANIMAL INSTINCT) سے متعلّق ہیں۔ انہیں انسانی فطرت نہیں کہا جاسکتا۔

طبعی زندگی کے علاوہ' اور اس سے بلند' انسان کی انسانی زندگی ہے۔

انسانی زندگی: یہ زندگی کس طرح بسر کی جائے' نہ اس کا علم انسان کے اندر ہے' اور نہ ہی وہ اس سلسلہ میں کسی خاص نہج پر زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اس لئے اس ضمن میں بھی اس کی فطرت کوئی نہیں۔ اس کے لئے اسے خارج سے راہ نمائی

ملتی ہے جسے وحیِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ اسے یہ راہ نمائی دی جاتی ہے اور اس کے بعد اسے اس کے اختیار و ارادہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ چاہے تو اسے قبول کر لے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ **وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ لا**

(۲۹ / ۱۸)" ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کی طرف سے حق آ گیا۔ سو جس کا جی چاہے اسے تسلیم کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے"۔ یوں قرآن نے انسان کو' اشیائے فطرت سے ممتاز کر کے ـــ جو ایک خاص روش پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں' صاحبِ اختیار و ارادہ ہستی قرار دے دیا اور اس طرح اس کا مقام کہیں بلند کر دیا۔ یوں یہ 'جہانِ آب و گِل سے ابھر کر' خدا کی بنیادی صفت (یعنی ذی اختیار و ارادہ ہونے) میں (بحدِ بشریت) شریک ہو کر' حدود فراموش ممکنات کا حامل بن گیا۔

ہم نے کیا کیا؟

قرآن نے انسان کو یہ مقام عطا کیا' لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد' مسلمانوں نے بھی فطرتِ انسانی کے فرسودہ تصوّر کو اپنا لیا اور جیسا کہ مذہب کی دنیا میں ہوتا ہے' اسے اپنے عقیدہ کا جزو بنا لیا۔ اتنا ہی نہیں' یہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ تورات میں کہا گیا تھا کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ مسلمانوں نے یہ تصوّر وہاں سے مستعار لیا اور یہ عقیدہ

وضع کرلیا کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے اور اس کے بعد کہا کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔

دینِ فطرت: یہ الفاظ آپ ہر محراب و منبر سے سنیں گے لیکن آپ دیکھیں گے کہ ان کا کوئی متعین مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں ہوگا۔ ان الفاظ کی حیثیت اَسْمَاءٌ سَمَّیْتُمُوْھَا اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمْ (۵۳/۲۳) سے زیادہ کچھ نہیں نظر آئے گی۔ یعنی چند نام جو انہوں نے خود یا ان کے اسلاف نے وضع کرلئے اور کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔ آپ بہت زیادہ زور دیں گے تو کہا جائے گا کہ اگر کسی انسانی بچے کو خارجی اثرات سے متاثر نہ ہونے دیا جائے وہ بڑا ہو کر جس نہج کی زندگی بسر کرے گا وہ اسلام کے مطابق ہوگی اور اسے اس کی فطرت کہا جائے گا اور وہی فطرتُ اللہ ہوگی۔ کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر نے اس کا تجربہ کیا تھا کہ اگر انسانی بچّہ کو خارجی ماحول سے غیرمتاثر رکھا جائے تو اس کی اندازِ زندگی کس قسم کی ہوگی۔ چنانچہ اس کے لئے اس نے ایک بچّے کو پیدائش کے ساتھ ہی کسی جنگل میں بھیج دیا جہاں اس کی حفاظت اور پرورش کا انتظام کر دیا۔ جب وہ بچہ بڑا ہوا تو وہ یکسر جنگلی جانور تھا۔ اکبر کے اس تجربہ کا تو یقینی طور پر علم نہیں' چند سال ادھر کا ذکر ہے کہ ہندوستان میں ایک انسانی بچّہ جنگل میں پایا گیا تھا جس کی عادات و خصائل بالکل حیوانوں جیسی تھیں۔ اسے یو۔پی کے ایک

ہسپتال میں رکھا گیا اور ہر ممکن کوشش کی گئی کہ وہ انسانی اطوار و عادات سیکھ جائے لیکن اس میں کامیابی نہ ہوسکی اور وہ بالآخر حیوانوں کی سی زندگی جی کر حیوانوں کی سی موت مرگیا۔۔ یہ ہے برادرانِ عزیز! "انسان کی فطرت" معلوم کرنے کے تجربات کا ماحصل!

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ فطرت مجبور کی ہوتی ہے' صاحبِ اختیار کی نہیں اور انسان صاحبِ اختیار ہے۔ اس کے اندر کچھ صلاحیتیں ہیں جنہیں یہ اپنی مرضی کے مطابق صرف کرسکتا ہے۔ اسے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملتی ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو کس طرح استعمال کرے۔ اگر یہ انہیں' اس راہ نمائی کے مطابق استعمال کرے تو اس کا نتیجہ انفرادی خوشگواریاں اور اجتماعی سرفرازیاں ہوگا۔ اسے اسلام کہا جاتا ہے۔ اگر یہ اس کے خلاف جائے' تو اس کا نتیجہ وہ جہنمی زندگی ہوگا جس میں اس وقت ساری دنیا مبتلا ہے۔ اسے کفر کا ماحصل کہا جاتا ہے۔

چھٹا افسانہ ـــــ انسانی ضمیر

اس افسانے نے کہ انسان کی ایک فطرت ہے' ایک اور افسانے کو جنم دیا اور وہ یہ کہ انسان کے اندر اک ایسی شے بھی ہے جو حق مطلق اور باطل مطلق (ABSOLUTE RIGHT

(AND ABSOLUTE WRONG یعنی غلط اور صحیح' جائز اور ناجائز میں تمیز کر سکتی ہے۔ اسے انسانی ضمیر (CONSCIENCE) کہا جاتا ہے۔ ضمیر کا افسانہ بھی عالمگیر صداقت کی حیثیت اختیار کر گیا اور دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ رہی جس کے ہاں اس کا تصوّر موجود نہ ہو۔ کہیں اسے "دل کی آواز" کہہ کر پکارا گیا۔ کہیں "اندرونی روشنی" کہا گیا۔ غلط روش پر چلنے والوں کے متعلق کہا گیا کہ ان کا ضمیر مردہ ہو گیا ہے۔ صحیح نہج اختیار کرنے والوں کے متعلق کہا کہ ان کا قلب زندہ یا دل بیدار ہے۔

قرآنی نظریہ: قرآن آیا اور اس نے اس افسانے کی حقیقت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔اس نے کہا کہ حیوانات کے اندر تو اس قسم کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ پہچان لیں کہ ان کے لئے کونسی روش' حیات بخش ہے اور کونسی ہلاکت آفریں ـــــ مرغی کے چوزوں کو انڈوں سے باہر نکلتے ہی اس کا علم ہوتا ہے کہ ان کی عافیت خشکی پر رہنے میں ہے اور بطخ کے بچوں کو سورج کی روشنی دیکھنے کے ساتھ ہی اس کا احساس ہوتا ہے کہ ان کی صحیح نشوونما پانی میں ہوگی۔ اسے حیوانی جبلّت (INSTINCT) کہا جاتا ہے۔ لیکن انسان کے اندر کوئی قوت ایسی نہیں جس سے وہ غلط اور صحیح میں امتیاز کر سکے۔ اس کی تو کیفیت یہ ہے کہ وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا ○ (۱۷ / ۱۱) انسان اپنی

ہلاکت سامانیوں کو اس طرح آوازیں دے دے کر بلاتا ہے جس طرح اسے اپنی منفعت بخشیوں کو بلانا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ بے حد جلد باز واقع ہوا ہے۔ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر جھٹ سے اپنے لئے ایک فیصلہ کرلیتا ہے اور اتنا بھی نہیں سوچتا کہ وہ اس کے لئے تباہی کا موجب ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حق و باطل میں تمیز کے لئے وحی کی راہ نمائی کا محتاج ہے۔ اگر یہ تمیز اس کے اندر موجود ہوتی تو اس کے لئے وحی کے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ انسان' دنیا میں سادہ لوح لے کر آتا ہے۔ اس کے بعد وہ جس قسم کے ماحول میں پرورش پاتا ہے' اس سے اس کی سیرت مرتّب ہوتی چلی جاتی ہے۔ جن باتوں کو اس معاشرہ میں معیوب سمجھا جاتا ہے' وہ بھی انہیں معیوب سمجھتا ہے۔ جنہیں وہ معاشرہ مستحسن قرار دیتا ہے' وہ انہیں اچھا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ معاشرہ کے یہی اثرات ہیں جنہیں ضمیر کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یعنی ضمیر نام ہے۔ INTERNALISED SOCIETY کا۔ ایک جینی بچہ گوشت سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ اس کے تصوّر سے اسے متلی ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس' ایک مسلمان بچّہ' بڑی مزے سے لے کر چوستا ہے۔ اسی بناء پر قرآن نے کہا کہ کوئی بات محض اس لئے حق (RIGHT) قرار نہیں پاسکتی کہ ایک شخص نہایت دیانتداری سے اسے حق سمجھتا ہے۔ نہ ہی کوئی شے اس لئے باطل سمجھی جاسکتی ہے

کہ ایک شخص اسے غلط سمجھتا ہے۔ انسان از خود' مطلق حق اور مطلق باطل INTRINSIC RIGHT AND WRONG میں تمیز نہیں کرسکتا۔اس کے لئے اسے ایک خارجی معیار (OBJECTIVE STANDARD) کی ضرورت ہے اور وہ خدا کی وحی ہے جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔

قرآن نے اس افسانے کو یوں بے نقاب کیا۔ لیکن مسلمانوں نے اس مسترد کردہ نظریہ کو پھر سے اٹھایا اور اپنے حریم قلب میں محفوظ رکھ لیا۔

لیکن ہم نے کیا کیا؟ چنانچہ اب ان کے ہاں بھی "ضمیر کی آواز" کے الفاظ بلاغل و غش بولے جاتے ہیں اور کوئی نہیں سوچتا کہ اس نظریہ کے مطابق' خارج (یعنی خدا) کی طرف سے وحی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ حق و باطل کے لئے قولِ فیصل' ضمیر کی آواز نہیں' خدا کی کتاب ہے۔ ضمیر کی آواز ہر انسان کی الگ الگ ہوسکتی ہے۔ لیکن خدا کی کتاب کا فیصلہ تمام انسانوں کے لئے ایک ہی ہوگا۔ انسانی ضمیر' صرف اس بات پر ملامت کرے گا جسے وہ معیوب سمجھتا ہے۔ لیکن یہ تو ضروری نہیں کہ جس بات کو ایک فرد کا ضمیر غلط یا معیوب نہ سمجھے' وہ صحیح ہو۔ اگر کسی کام کے صحیح ہونے کی سند' اس کام کے کرنے والے کی ضمیر کی آواز قرار دے دی جائے' تو دنیا میں کوئی شخص مجرم قرار ہی نہ پائے۔ ایک ڈاکو'

ایک قاتل' ایک راہ زن' ایک ٹھگ' اپنے اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق کام کرتے ہیں اور جب دنیا (یا عدالت) انھیں مجرم قرار دیتی ہے تو وہ انھیں مطعون قرار دیتے ہیں اور اپنے دل میں مطمئن ہوتے ہیں کہ ہم نے غلط کام نہیں کیا۔ عقلِ حیلہ جُو' ان کے برسرِ حق ہونے کے لئے ہزار دلیلیں مہیا کر دیتی ہے۔ کونسا سرمایہ دار ایسا ہے جس کا ضمیر اسے اس بات پر ملامت کرتا ہے کہ وہ ہزاروں مزدوروں کی محنت کا ماحصل اپنے گھر کیوں لے جاتا ہے! کونسا مرد ایسا ہے جس کا قلب اسے' اس بات پر مطعون کرتا ہے کہ وہ عورت پر حکومت کیوں کرتا ہے۔ یاد رکھیئے! صحیح راستے پر وہی چل سکتا ہے جو اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں' بلکہ وحی کی آواز کو حق کی آواز سمجھے۔ ہم نے ضمیر کے افسانے کو اس لئے سینے سے لگا رکھا ہے کہ ہم اپنی من مانی کر سکیں اور خدا کی کتاب کو اپنے معاملات میں حَکَم نہ تسلیم کریں۔

ساتواں افسانہ ----- تقدیر

عیسائیت نے اس افسانہ کو جنم دیا کہ ہر انسانی بچّہ' اپنے اوّلیں ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ ساتھ لئے پیدا ہوتا ہے اور اس بوجھ کو اپنے سر سے اتار دینا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ مرتّب ہوا کہ انسان بے بس اور مجبور ہے۔ ہندوؤں نے اس تصوّر

میں تھوڑی سی تبدیلی کی اور (یونانی فکر سے تناسخ کا عقیدہ مستعار لیتے ہوئے) کہا کہ ہر انسانی بچہ، اپنے پچھلے جنم کے گناہوں کی آلائش ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر جس قدر مصیبتیں آتی ہیں، وہ اس کے سابقہ جنم کے کرموں کی پاداش میں ہوتی ہیں -------- وہ کرم جن کا اسے کچھ علم و احساس نہیں ہوتا۔ اس سے یہ نظریہ وجود میں آیا کہ انسان کے ساتھ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے، وہ پہلے سے مقرر شدہ ہوتا ہے اور اسے بدلنے پر یہ قادر نہیں ہوتا۔ اسے قسمت، تقدیر یا PRE-DETERMINATION کا عقیدہ کہتے ہیں۔ یہ عقیدہ، مذہب کی دنیا تک ہی محدود نہ رہا بلکہ دنیائے فکر کو بھی اس نے اچھا خاصا متاثر کیا۔ چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفرز اس کے مؤید ہوگئے اور رفتہ رفتہ یہ بھی مسلمات میں شمار ہونے لگ گیا۔

قرآنی نظریہ: قرآن آیا اور اس نے اس افسانے کی حقیقت کو بھی بے نقاب کردیا۔ اس نے کہا کہ انسان، دنیا میں ایک سادہ لوح لے کر آتا ہے جس پر وہ اپنی تقدیر خود اپنے قلم سے لکھتا ہے۔ اس پر جو مصیبت بھی آتی ہے خود اس کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوتی ہے۔ **وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ** ۴۲/۳۰

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کہ تمہارا مستقبل پہلے سے

متعین اور مرتب نہیں ہوتا بلکہ تم خود اپنے ہاتھوں سے اپنا مستقبل تشکیل و تعمیر کرتے ہو' قرآنِ کریم ایک جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ وہ اصطلاح ہے مَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ جو کچھ تمہارے ہاتھ' پہلے سے بھیج دیتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان کا عمل پہلے سرزد ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ بعد میں برآمد ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر نتیجہ جو تمہارے سامنے آتا ہے وہ پیدا کردہ ہوتا ہے تمہارے اس عمل کا جو تم نے اس سے پہلے کیا ہو ("پہلے کیا ہو" سے مراد یہ نہیں کہ کسی پہلے جنم میں کیا ہو۔ قرآن کسی پہلے جنم کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس سے مراد ہے وہ عمل جو اس زندگی میں پہلے کیا گیا ہو)۔ یہ اصطلاح بڑی واضح ہے اور اس باطل عقیدہ کی بڑی شدّومدّ سے تردید کرتی ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ انسان کو جو کچھ پیش آتا ہے وہ پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے اور اس میں اس کے اختیار و ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (۶۲ / ۴) جب ان پر' ان کے ان اعمال کی وجہ سے جو یہ پہلے کر چکے ہیں' کوئی مصیبت آتی ہے تو ...... اس مضمون کی قرآنِ کریم میں متعدد آیات ہیں لیکن اس وقت میں ان میں سے صرف ایک پر اکتفا کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے' بنیادی سوال یہ ہے کہ:

مستقبل کی تعمیر: کیا انسان کا مستقبل پہلے سے مرتب

شدہ ہے یا وہ اسے خود اپنے ہاتھوں سے، جیسا جی چاہے، متشکل کر سکتا ہے۔ سورۂ حشر میں ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۵۹/ ۱۸) "اے جماعتِ مومنین! تمہیں چاہیے کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے رہو۔ اور ہر شخص کو چاہیے کہ وہ دیکھے کہ وہ اپنے کل کے لئے آج کیا آگے بھیجتا ہے۔" میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں اس سے زیادہ وضاحت سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہر انسان اپنا مستقبل خود اپنے ہاتھوں سے تعمیر کرتا ہے۔

جبر کا عقیدہ کفر ہے: کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے، انسان کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ کفر اور شرک ہے۔ سورۂ انعام میں ہے سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا (۶/ ۱۴۹) ان مشرکین سے پوچھو تو یہ فوراً کہہ دیں گے کہ واہ! ہم اپنے اس فعل کے ذمہ دار خود تھوڑے ہیں۔ اگر خدا کو ایسا منظور ہوتا تو ہم یا ہمارے آباؤ و اجداد کبھی مشرکانہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتے۔ یہ سب خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ انسان اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ قرآنِ کریم میں اس مضمون کی آیات بھی کئی ایک ہیں۔

ان آیات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم نے کس طرح اس

باطل نظریہ کی تردید کی کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے' یا انسان کا مستقبل پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے۔ یہ اس کی تعمیر اپنے ہاتھوں سے نہیں کرتا۔ بالفاظِ دیگر' قرآنِ کریم نے عقیدۂ تقدیر کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جس قوم نے اپنی نگاہ میں یہ تبدیلی پیدا کرلی تھی اس نے نہ صرف اپنی تقدیر کو سنوارا بلکہ زمانے کی تقدیروں کا رخ موڑ دیا۔

تقدیر شکن قوم: لیکن یہ ظاہر ہے کہ اپنی تقدیر اپنے ہاتھ سے لکھنے اور اپنا مستقبل آپ تعمیر کرنے کے لئے مسلسل جہاد اور پیہم تگ و تاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب انسان سمجھ لے کہ وہ اپنے ہر فیصلہ اور ہر عمل کا ذمّہ دار آپ ہے' تو اسے ایک قدم اٹھانے سے پہلے دس مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔ اور جب اسے اس کا علم ہو کہ وہ صرف اسی کا مستحق ہے جس کے لئے اس نے خود محنت کی ہو' تو اس کی زندگی ——— جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں کی فرہادیت کا مرقع ہوتی ہے۔ لیکن کام چور' سہل انگار' تن آسان' دوسروں کی کمائی پر عیش اڑانے والے' اپنی ذمّہ داریوں کو دوسروں کے سر تھوپنے کے عادی' اور محنت ہی نہیں بلکہ سوچنے سمجھنے کی زحمت بھی برداشت نہ کرنے کے خوگر انسان' اس قدر مسلسل سعی و عمل کی زندگی کو کیسے گوارا کرتے۔

اور ہم! اس کے لئے ان کی سوچی سمجھی تدبیر یہ تھی کہ

تقدیر کے جس نظریہ نے ان کی تن آسانیاں چھین لی ہیں، اس نظریہ کو بدل کر، پھر سے اسی افسانۂ کہن کا احیاء کر دیا جائے اور اس عقیدہ کو حقیقت قرار دے دیا جائے کہ

سب کام اپنے کرنے تقدیر کے حوالے
نزدیک عارفوں کے تدبیر ہے تو یہ ہے

چنانچہ انہوں نے یہ کیا اور ایسی سادگی و پرکاری سے کیا کہ کسی کو پتا ہی نہ چلا کہ یہ تبدیلی کیسے ہوگئی۔ ان کی یہ تدبیر کس قدر محکم اور دُور رس تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآنِ مجید نے ایمان کے پانچ اجزاء بتائے تھے، یعنی اللہ، ملائکہ، کتُب، رُسُل اور، آخرت پر ایمان۔ لیکن اب اجزائے ایمان میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا اور مسلمان ہونے کی یہ شرط قرار پا گئی کہ وہ کہے کہ

امنت باللہ و ملئکتہ و کتبہ و رسلہ و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالی و بعث بعد الموت یعنی تقدیر کا وہ باطل عقیدہ جسے قرآن نے آکر مٹایا تھا، اب مسلمانوں کا جزوِ ایمان بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ (اقبال کے الفاظ میں)

عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

آٹھواں افسانہ ——— نظامِ سرمایہ داری

آپ سوچتے ہوں گے کہ دین میں اتنی بڑی بنیادی تبدیلی کا،

جسے میں نے ابھی ابھی' تقدیر کے افسانے کے عنوان سے بیان کیا ہے' بالآخر جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ تاریخ کے طالب العلم کے لئے اس جذبۂ محرکہ کا سراغ پالینا چنداں مشکل نہیں۔ یہ سراغ اسے ایک اور افسانے میں ملے گا جس کے بغیر' پلاٹ مکمل نہیں ہو سکتا تھا--- اسے ذرا غور سے سنئے۔

خدا نے انسان کو پیدا کیا تو جس سازو سامان پر اس کی زندگی کا انحصار تھا اسے بھی اس کے ساتھ (بلکہ اس کی پیدائش سے بھی پہلے) از خود فراہم کردیا ------ یہ سامان کیا تھا؟ ہوا' پانی' روشنی' حرارت اور خوراک جس کے ذخیرے زمین میں مدفون تھے۔

سامانِ زیست کی بہم رسانی : اس نے یہ سامانِ زیست از خود فراہم کر دیا اور انسانوں سے کہہ دیا کہ یہ تمام ذی حیات کے لئے مشترکہ سامانِ زندگی ہے۔ اگر کسی نے اس پر ایسے بند لگا دیئے جس سے دوسرے انسان اس سے محروم رہ گئے تو اس سے بڑا ظالم' غاصب' اور نوعِ انسانی کا دشمن کوئی اور نہیں ہوگا۔ چنانچہ جب انسان اس نظریہ کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے (جسے قرآن نے آدم کی جنتِ ارضی سے تعبیر کیا ہے) تو سامانِ زیست سب کی مشترکہ متاع تھا۔ اس میں "میری اور تیری" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ **وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا** (۲/۳۵) جسے جس وقت اور جہاں بھی بھوک لگتی' وہ سیر ہو کر کھا لیتا۔ لیکن اس

میں ایک شرط ضروری تھی۔ انسان کو ہوا، روشنی، حرارت اور پانی تو بلا محنت و مشقت مل جاتا تھا لیکن زمین سے خوراک نکالنے کے لئے اسے محنت کرنی پڑتی تھی۔ جو لوگ محنت سے جی چرانا چاہتے تھے وہ ہر وقت اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے کہ کوئی ایسا انتظام ہو جائے کہ انہیں بغیر محنت کئے سامانِ زیست ملتا رہے۔

میری اور تیری کی تفریق: کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے ایک تدبیر ڈھونڈ نکالی۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے زمین پر لکیریں کھینچ کر کہہ دیا کہ یہ میری ہے۔ یہ دن انسانیت کی تاریخ میں انتہائی بد نصیبی اور سیاہ بختی کا تھا۔ اس سے ابنِ آدم اس جنتِ ارضی سے محروم ہو گیا جس میں اسے سامانِ زیست کے لئے کسی کا دست نگر اور محتاج نہیں ہونا پڑتا تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ سال بھر محنت کوئی کرتا اور اس کی محنت کا ماحصل وہ لے جاتا جس نے خدا کی مفت عطا کردہ زمین پر اپنی ملکیت کی لکیر کھینچ دی تھی۔ اسی "میری اور تیری" سے ان تمام فسادات کے پھاٹک کھل گئے جن سے یہ زمین جہنم زار بن گئی۔ اب ہر مستبد صاحبِ قوت "انا ربکم الاعلیٰ" کا اعلان کر کے، دوسروں کو اپنا محتاج اور محکوم بنانے لگ گیا اور ظاہر ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کا محتاج اور محکوم بن جائے تو شرف و مجدِ انسانیت افسانہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

سرچشمہ ہائے رزق پر ذاتی ملکیت کا یہ باطل افسانہ صدیوں

سے ایک مسئلہ کی حیثیت سے چلا آرہا تھا کہ قرآنِ کریم نے آکر یہ زلزلہ انگیز اعلان کیا کہ

قرآن کا اعلان: لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ط (۲/۲۸۴) زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے' سب خدا کی ملکیت ہے اور کسی کا یہ دعویٰ کہ وسائلِ رزق اس کی ذاتی ملکیت ہیں' دوسرا خدا بن جانا ہے۔ اس لئے اس نے پوری نوعِ انسان کو مخاطب کرکے کہا کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا (۲/۲۲) کسی کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ اور خدا کی زمین' خدا کے بندوں کے لئے کھلی چھوڑ دو۔

سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱/۱۰)

اس اعلانِ عظیم نے دنیائے انسانیت میں ایسا ولولہ انگیز انقلاب برپا کر دیا جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے نہیں دیکھی تھی۔ اس نے باطل کے اس نظامِ کہن کی بنیادوں تک کو اکھیڑ دیا جو صدیوں سے اعصابِ انسانیت پر مسلط چلا آرہا تھا اور انسانی تمدن کی عمارت کو نئی بنیادوں پر استوار کر دیا۔ اس کا جو نتیجہ مرتب ہوا' اسے حضور نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے دن' ان حقیقت کشا' مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں بیان فرما دیا کہ

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السموت والارض زمانہ پھر پھرا کر' آج پھر اسی نقطہ پر آگیا ہے جس

پر اللہ نے اسے تخلیقِ ارض و سما کے وقت ٹھیرایا تھا۔
یعنی اس نقطہ پر جہاں (جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں) کیفیت یہ تھی کہ جس شخص کو جہاں بھوک لگتی' سیر ہو کر کھانے کو مل جاتا اور کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہتا۔
ظاہر ہے کہ یہ نظام' ان لوگوں پر سخت شاق گزرتا تھا جو دوسروں کی محنت پر عیش سامانی کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے خلاف اپنی فریب انگیز تدبیریں شروع کیں اور آہستہ آہستہ اسی فرعونی اور قارونی نظامِ سرمایہ داری کو پھر سے انسانی معیشت بنا دیا۔ اس کے لئے اس افسانے کی اگلی کڑی ملاحظہ فرمایئے۔

نواں افسانہ ——— مذہبی پیشوائیت

آپ یقیناً" متعجب ہوں گے کہ دوسروں کی کمائی کو لوٹنے والا گروہ ہمیشہ چند افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور جن کی محنت لوٹی جاتی ہے وہ ننانوے فی صد سے بھی زیادہ۔ یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ انسانوں کی اس قدر اکثریت اس پر رضا مند ہو گئی کہ دوسرے ان کی محنت کا ماحصل لوٹ کر لے جائیں اور پھر انہیں' محض روٹی کی خاطر' ان کی غلامی اور محکومی اختیار کرنی پڑے۔ کوئی صاحبِ عقل و ہوش انسان' اس پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتا۔ اس پر وہی رضامند اور

مطلق ہوگا جس کی عقل کو ماؤف کرکے' اسے ہوش سے بے گانہ بنا دیا جائے۔

یہ بات جو آپ کے دل میں اس وقت کھٹکی ہے' باطل نظامِ سرمایہ داری کے حاملین نے اسے اسی زمانے میں بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے اسے اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ انسانوں کی اس قدر کثیر آبادی کو ' ڈنڈے کے زور سے اس پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی محنت کی کمائی ان کے حوالے کرکے' خود محتاجی اور محکومی کی زندگی بسر کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان پر اس قسم کا ہپناٹزم کیا جائے جس سے یہ ہپناسٹ کے اشاروں پر چلیں اور وہ کچھ کرتے چلے جائیں جس کا وہ انہیں حکم دے۔

یہ ہپناٹسٹ' مذہبی پیشواؤں کی شکل میں سامنے آئے۔

مذہبی پیشوائیت: قرآن نے انہیں "ہامان کا لشکر" قرار دے کر بتایا ہے کہ دسیسہ کار "مقدسین" کا یہ طائفہ کس طرح اپنی سحر انگیزیوں اور فریب کاریوں سے عوام سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب کرتا رہتا ہے۔ اس کے لئے ان کا نہایت موثر حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد و مفاد کو' احکامِ خداوندی کہہ کر پیش کریں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جہنم کے جھلسا دینے والے عذاب اور قبر کی اُستخواں شکن مار سے ڈراتے رہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اس قسم کے عقائد وضع کئے کہ امیری اور

غریبی سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ رزق کی بست و کشاد اس نے اپنے قبضۂ قدرت میں رکھی ہے جس میں انسان کا کوئی دخل نہیں۔ وہ جسے چاہے بے حساب دولت عطا کردے' جسے چاہے مفلس اور محتاج رکھے۔ رزق کے ایک ایک دانے پر ہر شخص کی مہر ہوتی ہے۔ اسی کو قسمت کا لکھا اور تقدیر کا نوشتہ کہا جاتا ہے جسے بدلنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔

راضی برضا رہنا: جو شخص اپنی مفلسی و محتاجی اور دوسروں کی دولت و ثروت کے خلاف زبان پر حرفِ شکایت لاتا ہے وہ خدا کے فیصلوں کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ اس سے بڑا جرم دنیا میں اور کیا ہوسکتا ہے۔ اس لئے انسان کو ہمیشہ راضی برضا رہنا چاہئے اور جس حالت میں وہ رکھے' اس پر صبر شکر کرنا چاہئے۔

اب آپ نے دیکھا' برادرانِ عزیز! کہ وہ جو تقدیر کے عقیدہ کو جزوِ ایمان بنایا گیا تھا' اس کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ اس کا جذبۂ محرکہ تھا نظامِ سرمایہ داری کی گرہوں کو مضبوط کرنا' یعنی محنت کش عوام کو ایسے ہپناٹزم کے عمل سے مسحور رکھنا جس سے وہ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کو بے دریغ لٹتے دیکھیں اور ان لوٹنے والوں کے خلاف' حرفِ شکایت زبان تک نہ لائیں۔ یہی ہے وہ ہپناٹزم جس کی سحر کاریوں کی وجہ سے اس قسم کے انسانیت کش فتاویٰ' عین اسلام بنا کر دکھا دیئے جاتے ہیں کہ

جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ
اتنا روپیہ' اتنے مکان' اتنا تجارتی کاروبار' اتنے مویشی' اتنی
موٹریں' اتنی کشتیاں' اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ
سکتے ہو' اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے
زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو ——— اسلام
نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے'
کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت'
جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق اور واجبات ادا
کئے جاتے رہیں' بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے

(مسئلہ ملکیتِ زمین، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۴۷ ۔ ۵۲)

دونوں کا گٹھ جوڑ آپ کے دل میں شاید یہ سوال پیدا ہو کہ
نظامِ سرمایہ داری کی حمایت کرنے میں' ان (مذہبی پیشواؤں) کا کیا
فائدہ ہے؟ اگر آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہے تو اس کے معنی
یہ ہیں کہ آپ نے اس فتویٰ کے آخری الفاظ پر غور نہیں کیا جسے میں
نے ابھی ابھی آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان الفاظ کو ایک مرتبہ پھر
سن لیجئے۔ کہا گیا ہے کہ دولت' زمین اور دیگر وسائلِ پیداوار وغیرہ پر
بے حد و نہایت ملکیت رکھنی جائز ہے۔
"بشرطیکہ ان سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق اور واجبات ادا کر

دیئے جائیں۔"

یہ "شرعی حقوق اور واجبات" جنہیں سرمایہ دار ادا کرتے ہیں، کس کی جیب میں جاتے ہیں؟ انہی حضرات کی جو نظامِ سرمایہ داری کو عین اسلام بنا کر پیش کرتے ہیں! آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ زکوٰۃ اسلامی حکومت کے انکم ٹیکس ہی کا نام ہے، تو ان حضرات کی طرف سے کس قدر شور مچا دیا جاتا ہے کہ انکم ٹیکس، حکومت کا ٹیکس ہے اور زکوٰۃ خدا کا ٹیکس۔ اس لئے یہ خدائی ٹیکس، حکومت کے ٹیکس میں مدغم نہیں ہو سکتا۔ حکومت کا ٹیکس حکومت کو دو، اور خدا کا ٹیکس ہمارے حوالے کرو کیونکہ ہم حکومتِ خداوندی کے ٹیکس کلکٹر ہیں —— یہ ہیں مذہبی پیشوائیت کے وہ مفادات جن کے لئے یہ لوگ نظامِ سرمایہ داری جیسے انسانیت سوز نظام کو عین اسلام قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مذہبی پیشواؤں اور سرمایہ داروں کو ایک ہی زمرہ میں شمار کیا ہے جب (سورۃ توبہ کی ایک ہی آیت میں پہلے) کہا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اے جماعتِ مومنین! یاد رکھو! ان علماء و مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو عوام کا مال ناجائز طریقے سے کھا جاتے ہیں اور لوگوں کا راستہ روک کر کھڑے رہتے ہیں کہ وہ کہیں خدا کے مقرر کردہ نظام کی طرف نہ آجائیں۔ یہ

ہوئے احبار و رہبان' یعنی مُلّا اور پیر۔ اس کے بعد ہے وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ (۹/۳۴) دوسرا گروہ ہے سرمایہ داروں کا جو دولت کے انبار در انبار جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں (نوعِ انسان کی بہبود کے لئے) کھلا نہیں رکھتے۔ تم ان سے کہہ دو کہ تمہاری اس رَوش کا مآل ایسی دردانگیز تباہی ہوگا (جس سے تمہیں کوئی بچا نہیں سکے گا)۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے' سرمایہ دار وہی نہیں جو انبار در انبار دولت جمع کرے۔ اس کے نزدیک' ہر وہ شخص سرمایہ دار (مترف) ہے جو محنت کرنے کی استعداد کے باوجود' دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرے خواہ وہ بھکاری ہی کیوں نہ ہو۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مذہبی علماء و مشائخ اور دولت جمع کرنے والے' دونوں کو سرمایہ دار کہہ کر پکارا ہے۔ اور اصل پوچھئے تو علماء و مشائخ کی سرمایہ داری' دولتمندوں کی سرمایہ داری سے بھی زیادہ شدید ہوتی ہے۔ دولت مند سرمایہ دار تو پھر بھی کچھ سرمایہ لگا کر دوسروں کی کمائی غصب کرتا ہے۔ یہ حضرات ایک پیسہ نہیں لگاتے اور دوسروں کی کمائی کھاتے چلے جاتے ہیں۔ اور کمائی صرف محنت کشوں ہی کی نہیں کھاتے' سرمایہ داروں کی کمائی بھی کھا جاتے ہیں۔ بلھے شاہ سچا تھا جب اس نے ان خود ساختہ خدائی نمائندوں کو "ٹھگاں

دے ٹھگ" کہا تھا۔

اب آپ نے سمجھ لیا برادرانِ عزیز! کہ قرآنِ کریم نے فرعون' قارون اور ہامان تینوں کو کیوں ایک ہی افسانہ کے لازمی کردار (کیریکٹر) قرار دیا تھا اور عقیدۂ تقدیر کو کیوں کفرو شرک کہہ کر پکارا تھا؟

دسواں افسانہ ـــ شریعت اور طریقت کا امتیاز

میں نے ابھی ابھی سورۂ توبہ کی جو آیت پیش کی ہے اس میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ قرآنِ کریم نے احبار اور رہبان کے دو الگ الگ گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ احبار کے معنی ہیں علماء اور رہبان کہتے ہیں مشائخ کو۔ انسانی زندگی میں اس ثنویّت (DUALITY) کا تعلّق بھی ایک بڑے دلچسپ افسانے سے ہے جسے' اُمّید ہے' آپ غور سے سنیں گے۔

خدا نے انسانی راہ نمائی کے لئے' وحی کے ذریعے دین عطا کیا تو اس کے اصول' قوانین' احکام نہایت واضح تھے جن کے سمجھنے کے لئے نہ کسی افلاطون کی حکمت کی ضرورت تھی نہ کسی ارسطو کی منطق کی حاجت۔ یہ احکام و قوانین صاف' سیدھے اور سادے تھے۔ ان کے عملی نفاذ کے لئے ایک نظام کی ضرورت تھی۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کوئی فرد کسی دوسرے

سے اپنے حکم کی اطاعت نہیں کراسکتا تھا۔ اس میں سب' احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے تھے۔

لیکن جو لوگ' دوسروں سے اپنی اطاعت کرانا چاہتے تھے' انہوں نے کچھ قوت جمع کی' دین کے نظام کو الٹا اور اس کی جگہ اپنی حکومت قائم کرلی اور اس طرح شرفِ انسانیت کی اس تذلیل کا سامان فراہم کردیا جس میں ایک انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کا غلام اور تابع فرمان بنا دیا جاتا ہے۔

اربابِ شریعت: لیکن ابھی ہوسِ اقتدار رکھنے والوں کا ایک گروہ باقی تھا جس کے پاس قوت تو تھی نہیں لیکن وہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ حکومت کا تعلق دنیاوی امور سے ہے' انسان کی عاقبت سنوارنے کا تعلق اس سے نہیں۔ اس کے لئے تمہیں احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنی ہوگی۔ لیکن احکامِ خداوندی ہر خاص و عام کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ انہیں ہم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے ہم جس بات کے متعلق کہہ دیں کہ وہ خدا کا حکم ہے' تم اسے خدا کا حکم سمجھو اور اس کی اطاعت کرو۔ اگر تم نے اس میں مین میخ نکالی یا سرتابی برتی' تو سیدھے جہنم رسید ہوجاؤ گے ——— سادہ لوح عوام' جہنم کے عذاب سے ڈر گئے اور ان لوگوں کی اطاعت اختیار کرلی۔ یہ تھا احبار کا گروہ جنہیں "علماء کرام" کہا جاتا ہے۔ اس طرح انسان'

جسے فطرت نے آزاد پیدا کیا تھا' دوہری غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا: ایک اربابِ حکومت کی غلامی اور دوسری ان خداوندانِ شریعت کی غلامی۔

اربابِ طریقت : ان کی دیکھا دیکھی' ایک اور گروہ کے سینے میں بھی ہوسِ اقتدار نے انگڑائی لی۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہے اور اربابِ شریعت کا تعلق زندگی کے ظواہر سے۔ اصل چیز روحانیت ہے' جس کا علم نہ اربابِ حکومت کے پاس ہے نہ اصحابِ شریعت کے ہاں۔ اس کا تعلق باطن سے ہے اور باطن کا علم نہ کتابوں سے حاصل ہوسکتا ہے' نہ دانش گاہوں سے۔ یہ علم' سینہ بسینہ چلا آرہا ہے اور مقربینِ بارگاہِ خداوندی کے آستانوں پر سجدہ ریزی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے شرعی رسوم و مناسک کی طول طویل مسافتیں طے نہیں کرنی پڑتیں۔ یہ خدا تک پہنچنے کا براہِ راست اور مختصر ترین راستہ (SHORT CUT) ہے۔ اس کے لئے بس مرشدِ کامل کی ایک نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے جس سے چودہ طبق روشن ہوجاتے ہیں۔ سہل نگار انسان کو اس دعوت میں بڑی دل کشی محسوس ہوئی اور اس نے لپک کر ان آستانوں کے مقدس پتھروں پر اپنی جبینِ نیاز رکھ دی۔ اس طرح' انسانوں کی غلامی کی ایک اور زنجیر وجود میں آگئی۔ اس کی ابتدا یہودیوں کے ہاں سے ہوئی تھی

جہاں اس جدید روحانی مملکت کے اربابِ حل و عقد' رہبان کہلاتے تھے۔ مسلمانوں کے ہاں یہ حضرات' اہلِ طریقت کے نام سے متعارف ہوئے۔ یوں' دنیاوی حکومت سے الگ' مذہب کی دنیا میں' شریعت اور طریقت کی دو مملکتیں وجود میں آگئیں جو ایک دوسرے کی رقیب اور حریف بن گئیں۔ اربابِ شریعت (یعنی علماء کرام) کے پاس' لوگوں کو اپنی غلامی میں ماخوذ رکھنے کے لئے جہنم کے عذاب کا خوف اور جنت کی حوروں کا لالچ تھا۔ لیکن ان دونوں کا تعلق آخرت سے تھا۔ لوگوں کو اس دنیا میں دینے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ ان کے برعکس' اربابِ طریقت اسی دنیا میں کرامات دکھاتے تھے اور لوگوں کی مرادیں بر لاتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ اس قسم کے نقد کو چھوڑ کر مُلاّ بیچارے کے ادھار کی طرف کون جاتا۔ نتیجہ یہ کہ ان حضرات کے آستانے ایسی پُرکیف جاذبیتوں کے مرکز بن گئے جو اربابِ مساجد و مکاتب کے تصور تک میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ اربابِ شریعت کے پاس' ان کے مقابلہ کے لئے ایک حربہ ایسا تھا جس کا جواب ان کے مخالفین سے بمشکل بن پڑتا تھا اور وہ یہ کہ یہ لوگ اپنے دعاوی کے ثبوت میں کسی نہ کسی امام' حتیٰ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پیش کر دیتے تھے۔ اربابِ طریقت نے' ان کا ایسا توڑ سوچا جس کا جواب نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم انسانوں کی سندوں سے دلائل پیش

۱۔ جنت' جہنم' آخرت پر ایمان' مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے لیکن اس مفہوم کے ساتھ جسے قرآن نے بیان کیا ہے

کرتے ہو۔ ہم براہِ راست خدا سے دریافت کر آتے ہیں کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا۔ فرمایئے! سند اور حُجت کے اعتبار سے انسانوں کا قول زیادہ وقیع ہو سکتا ہے یا ارشادِ خداوندی جو بغیر کسی غیرخدائی واسطہ کے ملا ہو؟ سوچئے کہ اس دلیل کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔ اس طرح حضرات اولیاء کرام کے کشف و الہام کا افسانہ وجود میں آیا تھا۔

باطنی ذریعۂ علم: قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ انسان کو جو علم، براہِ راست خدا کی طرف سے ملتا ہے اسے وحی کہتے ہیں، اور وحی نبی کے سوا کسی اور کو نہیں مل سکتی۔ وحی آخری مرتبہ حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی اور اس کے بعد نبوّت کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ ان اربابِ طریقت نے وحی کی بجائے کشف اور الہام کی اصطلاحات وضع کر لیں اور کہا کہ اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ اس طرح انہوں نے اس دروازہ کو چوپٹ کھول دیا جسے ختمِ نبوّت نے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تھا۔ سنئے کہ اس باب میں سرطائفۂ اربابِ طریقت، شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اپنی کتاب فصوص الحکم میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

> اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں واضح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں، اجتہاد کرتے ہیں مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول

قرآن و حدیث ہوتے ہیں۔

تصوّف کے عقائد: اس کے برعکس، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعے خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔ پس ایک طور پر مادۂ کشف و الہام اور مادۂ وحی رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ایک ہے۔ صاحبِ کشف، اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیّین کے موافق ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا لینا ہے۔ بالفاظِ دیگر، جس مقام سے نبی لیتے تھے، اسی مقام سے انسانِ کامل، صاحب الزّمان، غوث قطب لیتے ہیں۔

یہ ہے وہ مقدّس ترین افسانہ جس نے نبوّت جیسی حقیقتِ کبریٰ کی جگہ لے لی۔ ختمِ نبوّت سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی آزادی سے سرفراز کیا تھا جس کا تصوّر بھی دنیائے مذاہب میں نہیں مل سکتا۔ لیکن دوسروں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے خوگر انسانوں نے، لفظی طور پر ختمِ نبوّت کے اقرار کے باوجود، معنوی طور پر اس کا کھلا ہوا انکار کیا اور اس افسانے کو ایسی نگاہ فریب حقیقت کا لبادہ اوڑھایا کہ قرآن کو سینے سے لگائے لگائے پھرنے والوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جن کی گردنیں اس کے سامنے نہ جھکتی ہوں۔ یہ سحرِ سامری ان کے خون کے ذرّات تک میں حلول کرچکا ہے۔ ان حضرات کے آستانے اسی لئے مرجعِ انام بنے رہتے ہیں کہ

یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ تمہیں محنت و مشقت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے نذرانے پورے کرتے جاؤ' تمہاری سب مرادیں خودبخود پوری ہوتی جائیں گی۔ یہ عقیدہ محنت سے جی چرانے والی قوم کے لئے بڑا دل کش ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ' قاعدے اور قانون کے مطابق چل کر محنت سے کمانے کے بجائے' بیٹھے بٹھائے مرادیں حاصل کرلینے کی ہوس میں' ان آستانوں کی طرف لپک کر جاتے ہیں اور جوں جوں ان میں محنت کے بغیر مفادات حاصل کرنے کی ہوس بڑھتی چلی جاتی ہے' اس جال کی گرہیں اور مضبوط ہوتی جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد' مسلمانوں کو لوٹ کی چاٹ پڑ گئی اور بیٹھے بٹھائے شباشب کروڑ پتی(Over-Night Millionaire)بننے کا جو چسکا پڑا' تو اس سے ان خانقاہوں اور درگاہوں کا کاروبار کس قدر چمک اٹھا ہے۔

گیارھواں افسانہ ——— مُردوں کی روحانی قوّتیں

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ ارباب طریقت کے وجۂ مرجعِ انام بننے میں ان کی "کرامات" کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ کرامات کی وجہ سے وہ فوق البشر سمجھے جاتے ہیں اور اسی بناء پر یہ عقیدہ قائم ہوجاتا ہے کہ وہ لوگوں کی مرادیں پوری کرسکتے ہیں۔ یہ اس قسم کے عقائد' عقیدت مندوں سے نذرانے وصول کرنے کا بڑا مؤثر حربہ

ہے۔ لیکن اس میں نقص یہ تھا کہ یہ حضرت صاحب کی زندگی تک محدود رہتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد' ان کی جگہ' اسی قسم کے ایک اور حضرت صاحب کو مسند نشین کرانا پڑتا تھا۔ ان لوگوں نے اس دشواری کا حل یہ نکالا کہ یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ اولیاء اللہ مرتے نہیں' صرف پردہ کرلیتے ہیں۔ ان کی روحانی قوتیں' ان کے پردہ کرلینے کے بعد بھی بدستور باقی رہتی ہیں۔ یہ تدبیر بڑی کامیاب ثابت ہوئی ——— وہ جو کہتے ہیں کہ ہاتھی جیتے کا لاکھ' مرے کا سوا لاکھ' وہ مثل ان پر صحیح صادق آتی ہے۔ ان کی وفات کے بعد' ان کے مزارات پر' مرادیں مانگنے والوں کا ہجوم اس سے بھی زیادہ ہوجاتا ہے جس قدر ان کی زندگی میں ہوتا ہے۔ اس طرح یہ قبریں مستقل جاگیریں بن جاتی ہیں۔

قرآنی نظریہ: یہ افسانہ بھی' دنیا کی ہر قوم میں حقیقت کا نقاب اوڑھ چکا تھا کہ قرآن نے آکر اس نقاب کو نوچ کر پھینک دیا اور اعلان کردیا کہ کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے اور یہ قوانین ایسے اٹل ہیں کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۵/۴۳)۔ یہی وجہ ہے کہ اور تو اور' خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (کہ جن سے بڑا ولی اللہ کوئی نہیں ہوسکتا)

کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرا دیا گیا کہ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (۱۰/۴۹) ان سے کہہ دو کہ میں' دوسروں کے لئے ایک طرف' خود اپنی ذات کے لئے بھی خدا کے قانون سے ہٹ کر' کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ اب ظاہر ہے کہ جب دنیا کی وہ بزرگ ترین ہستی --- جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ---

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

--- کسی کے لئے کسی قسم کے نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتی تھی' تو کوئی اور اس قسم کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔ باقی رہیں کرامات' سو قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اس کی تصریح موجود ہے کہ مخالفین' نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تقاضا کرتے کہ آپؐ کوئی معجزہ دکھائیں اور آپ فرماتے کہ میرا معجزہ یا تو خدا کی یہ کتاب ہے اور یا پھر میری سیرت و کردار جو آپ لوگوں کے سامنے ہے۔

کرامات: اس کے علاوہ' میں کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ سو' جب خدا کے آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنے متعلق یہ ارشاد تھا تو کسی اور کا یہ دعویٰ کرنا' یا اس کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اس سے خارقِ عادت کرامات سرزد ہوتی ہیں' (معاذ اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بلند مقام رکھنے کا دعویٰ ہے۔ (کرامات کی اصل و حقیقت کیا ہوتی ہے' اس کی تشریح کا یہ موقع

نہیں۔ اِس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ میں نے خود عمر کا ایک حصہ انہی وادیوں میں گذارا ہے۔ اس لئے مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ اِن کی اصل و حقیقت کیا ہوتی ہے۔ آپ اتنا سمجھ لیجئے کہ ان کا تعلق دین سے بہرحال نہیں ہوتا۔ یہ ایک فنی چیز ہے)۔ باقی رہے مُردے اور ان کی قوتیں' سو اس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ وہ نہ کسی انسان کی بات سن سکتے ہیں نہ کسی بات کا جواب دے سکتے ہیں اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۚ (۳۵/۱۴) تم انہیں لاکھ پکارو' انہیں اس کی خبر تک بھی نہیں ہوتی۔ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ (۴۶/۵) اسی لئے خدا نے انسانوں سے کہہ دیا کہ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ (۱۰۶ / ۱۰) تم خدا کے سوا کسی کو مت پکارو۔ اس کے سوا کوئی بھی تمہیں نفع یا نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ نفع اور نقصان' خدا کے قانون کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ اس لئے تم ہر معاملہ میں اسی کے قوانین کی طرف رجوع کرو۔

یوں قرآن نے انسان کو اس غلامی سے نجات دلائی جس سے بدتر غلامی کوئی اور نہیں ہوسکتی' یعنی وہ غلامی جس کی زنجیریں کہیں باہر سے نہیں پہنائی جاتیں بلکہ انسان انہیں اپنی عقیدتمندیوں کی آہنگری سے تیار کرتا اور ارادتمندی کے ہاتھوں سے پہنتا ہے۔

اور ہم! قرآن نے یہ کیا لیکن اس کے بعد مسلمانوں نے، طلسمِ ہوش رُبا کے اس افسانے کے بکھرے ہوئے اوراق کو ایک ایک کرکے اکٹھا کیا اور اس مقدّس صحیفے کو اپنے دل کے طاقوں میں سجا کر رکھ لیا۔ چنانچہ آج زندہ اور مُردہ انسانوں کی جس قدر پرستش ان کے ہاں ہوتی ہے، شاید ہی کسی اور قوم میں اس کی مثال ملتی ہو۔ اور ہمارے ہاں تو اب محکمۂ اوقاف کی حسنِ کارکردگی سے اس افسانۂ کہن میں وہ رنگ آمیزیاں شروع ہوئی ہیں کہ اس کے مٹنے والے نقوش، مطلّا اور مرصّع طور پر ابھارے، نکھارے اور سنوارے جارہے ہیں۔ اور ابلیس نے جو اپنے مشیروں سے کہا تھا کہ تمہاری کامیابی کا راز اس میں ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

پاکستان میں اس کے اس مشورہ پر بڑی تندہی سے عمل کیا اور کرایا جارہا ہے۔

حرفِ آخر: میں نے، عزیزانِ من! بات شروع کی تھی تو خیال تھا کہ دوچار افسانوں میں قصّہ ختم ہوجائے گا۔ لیکن یہاں کیفیت یہ ہے کہ ---- دربزمِ توئی خیزد، افسانہ زِافسانہ ——— یہاں بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور رات ختم ہوجانے پر بھی افسانہ

ختم نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ افسانہ در افسانہ کی یہی کیفیت
تھی جس کے پیشِ نظر کہنے والے نے کہا تھا کہ

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

لیکن میں اب آپ کو مزید زحمت نہیں دینا چاہتا۔ بالخصوص اس لئے کہ بچے، نانی اماں سے جو افسانے سنتے ہیں ان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انہیں نیند آجاتی ہے۔ لیکن میرے بیان کردہ یہ افسانے ایسے ہیں جن سے، صاحبِ احساس کی کئی راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ سوچتا رہتا ہے کہ ہمارے ساتھ بالآخر ہوا کیا ہے؟ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے اسے حکیم الامّت نے چند لفظوں میں بیان کر دیا جب کہا کہ

ذرا سی بات تھی، اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے

دین کی اصل : وہ ذرا سی بات یہ تھی کہ خدا نے وحی کے ذریعے کچھ مستقل اقدار، کچھ غیر متبدّل اصول دیئے اور کہا کہ تم ایک ایسا نظام قائم کرو جو ان اقدار کو معاشرہ میں عملاً" نافذ کرے اور ان اصولوں کو اپنا ضابطۂ حیات بنائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان ہر نوع کی خارجی اور داخلی غلامی سے آزاد ہو کر، سرفرازیوں

اور سربلندیوں کی زندگی بسر کرتا چلا جائے گا۔ حاکموں کی غلامی' سرمایہ داروں کی غلامی' مذہبی پیشواؤں کی غلامی' روحانی مقتداؤں کی غلامی' حتیٰ کہ خود اپنی پست حیوانی خواہشات کی غلامی۔ انسان ان تمام غلامیوں سے آزادی حاصل کرکے' زندگی کے ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا اور بلند ہوتا چلا جائے گا۔۔ یہ تھی وہ "ذرا سی بات" جسے خدا نے الدّین کہہ کر پکارا تھا۔ اس نے الدّین عطا کیا اور ساتھ ہی (WARNING) دے دی کہ تم سامریوں سے بچنا۔ وہ ان حقائق کو تمہاری نظروں سے اوجھل کرکے' تمہیں قصّے کہانیوں میں الجھا دیں گے۔ السامری کے معنی داستان گو ہیں' یعنی حقائق کی جگہ افسانے وضع کرنے والے۔ بس اس ایک لفظ میں ہماری ساری داستان پوشیدہ ہے۔ خدا نے حقائق عطا کئے تھے' سامریوں نے ہمیں' ان کی جگہ' داستانوں اور افسانوں میں الجھا دیا۔ اب دین نام ہی چند قصّوں اور کہانیوں کا رہ گیا ہے ——— وہ قصّے اور کہانیاں جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ——— "مزے میٹھے' اثر خواب آوری" ——— ان قصّوں کے لفظ لفظ میں افیون کی آمیزش ہے جسے ہزار برس سے اس قوم کو پلایا جارہا ہے۔ یہ ہے ہمارا موجودہ مذہب۔ اب ظاہر ہے کہ جس قدر اس افیون کی تقویت کا سامان بہم پہنچایا جائے گا' قوم کے اعصاب شل ہوتے چلے جائیں گے۔ جب تک قوم سے اس افیون کو نہیں چھڑایا جائے گا' اس کے اعصاب کام

کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ افیون فروشوں نے اس سلسلہ میں ایک اور افسانہ وضع کررکھا ہے اور وہ یہ کہ افیون کبھی چھوٹ نہیں سکتی۔

لیکن ہمارے زمانے میں ' دنیا کی سب سے زیادہ اور قدیمی افیون زدہ قوم نے اس افسانے کو بھی جھٹلا کر رکھ دیا۔ اس نے ایک ایسی انقلابی جھُرجھُری لی جس سے افیون ہی نہیں چھوٹی' لالہ کے پودے تک جڑوں سے اکھڑ گئے۔

لیکن اس قوم نے یہ جھُرجھُری کیسے لی' یہ داستان بھی سننے کے قابل ہے۔ کہتے ہیں کہ جب چین کی مجلسِ اقتدارِ اعلیٰ نے افیون کی بندش کا قانون پاس کر دیا تو اس کا مسوّدہ آخری دستخط کے لئے وزیرِ اعظم کے سامنے آیا۔ اتفاق سے وہ خود افیون کھاتا تھا۔ اس نے اس مسوّدۂ قانون کو ایک طرف رکھ دیا اور خود' خاموشی سے' کہیں چلا گیا۔ چین اور اس کے ایک جزیرہ کے درمیان ایسی کشتیاں چلا کرتی تھیں جو نہ اِس طرف ساحل تک آتی تھیں ۔ نہ اُس طرف ——— مہینوں پانی میں رہتی تھیں۔ اس نے افیون کی ڈبیا ساحل پر پھینکی اور اس کشتی میں جا بیٹھا۔ اور مہینہ بھر تک اس میں رہا۔ نہ کشتی کسی ساحل سے لگی' نہ اسے کہیں سے افیون دستیاب ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ اب افیون کی عادت چھوٹ چکی ہے' تو وہ آیا اور مسوّدۂ قانون پر دستخط کرکے اسے ملک میں نافذ

کردیا۔ اس نے قرآن کی اس حقیقت کو پالیا تھا

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ (۶۱/۳)

یہ بہت بُری بات ہے کہ تم لوگوں سے وہ کچھ کہو جسے خود نہ کرو۔

قوموں سے افیون چھڑانے کا اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں کہ افیون چھڑانے والے پہلے خود افیون چھوڑیں ---

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

والسلام